QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

عصر حاضر میں مدارس کی سماجی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا تجزیاتی مطالعہ

An analytical study of the social and societal responsibilities of Madrassas in the modern era

ڈاکٹر معظم علی

سی ٹی آئی(CTI) گورنمنٹ گریجویٹ کالج راوی روڈ شاہدرہ، لاہور

Abstract

In the contemporary socio-political and educational landscape, Islamic seminaries or madrassas hold a pivotal position, especially in Muslim-majority societies. Historically, madrassas have been centers of religious, intellectual, and civic development. However, their role and responsibilities have come under renewed scrutiny in the modern era, marked by rapid globalization, technological change, and evolving social dynamics. This analytical study explores the social and societal responsibilities of madrassas in today's context, examining both their traditional functions and the expectations placed upon them in contemporary society. The primary objective of this study is to critically evaluate how madrassas can contribute positively to modern social development while remaining anchored in Islamic traditions. Drawing upon classical Islamic scholarship, historical functions of madrassas, contemporary educational challenges, and socio-religious demands, the paper outlines a multi-dimensional framework through which madrassas can fulfill their social responsibilities.

***Key words**: Contemporary, pivotal position, Globalization, Responsibilities*

تعارف موضوع

مدارس! ایک دینی ومسلکی اصطلاح ہے جس کے پس منظر میں ایسے جامعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو صرف دین ومسلک سے متعلق تعلیمات کو پڑھانے وانُہیں فروغ دینے کے لیے بنائے جاتے ہیں اور اِن مدارس کا بنیادی واوّلین مقصد دین وملت کے علوم کی نگہبانی وترجمانی کرنا ہوتا ہے تاکہ مسلم شناخت محفوظ رہنے کے ساتھ ساتھ تہذیبی روایات کی روشنی میں پروان چڑھتی رہے اور نسلِ نَو نہ صرف اسلاف کی جدوجہد وروایات سے کامل آگاہی حاصل کرے بلکہ اُنہیں ترویج دینے میں بھی اپنا کردار ادا کرسکے اور ایک ایسا سلسلہ سند قائم رہے جس کہ اّول خشت مدینہ منوّرہ میں صفہ کے مقام پر آنحضورِ اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے رکھی اور یہی تسلسل آج بھی اِن مدارس کا طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے مرور زمانہ کے سبب پیدا ہونے والے نشیب وفراز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہی فرائض سرانجام دیے جو اوّل دن سے اِن پر عائد تھے اور جو اہداف ومقاصد اِن کے لیے متعین کیے گیے۔

لہذا! مدارس نہ صرف تاریخی روایات کے امین ہیں بلکہ اسلامی تہذیب وثقافت کے علمبردار بھی گردانتے جاتے ہیں کہ تاریخ مختلف ادوار جیسا کہ زمانہ خلافت صحابہ کرامؓ، اموی، عباسی، عثمانی اور برصغیر میں مسلمانون کے دور حکومت سے ہوتی ہوئی زمانہ حال تک پہنچتی ہے اور مدارس ہی اِن تمام ادوار میں رجال کار پیدا کرنے میں مصروفِ عمل رہے اور جب بھی اسلام واسلامی نظام سیادت وسیاست وحکومت پر کڑا وقت آیا، انہی کے دم وقدم سے اُن تمام فتنوں سے مسلمانانِ ملت سُرخرو ہوئے اور وہ تمام تہذیبی وثقافتی روایات جو پیغمبر اسلام ﷺ کی بتلائی وسیکھائی گئی تعلیمات کی روشنی میں مدوّن مروّج ہوئیں، اِنہی کے باعث چار دانگ عالم میں اپنی

حقیقی صورت لیے جلوہ افروز ہوئیں اور سلاطین و مصلحین انگشت بدنداں رہتے کہ یہ خرقہ پوش کس منبع و مرکز سے علوم شہنشاہی حاصل کرکے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں کہ ظاہر میں غلام ہیں مالکِ کونین کے گو پاس کچھ رکھتے نہیں، پھر بھی دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں۔

علیٰ ہذا القیاس! کہ ہر قسم کی ممکنہ کشادگی اور مسلط تنگی داماں کے باوجود مدارس ایسے قابلِ استفادہ افراد کو تیار کر رہے ہیں جو معاشرے کی دینی ضروریات کو پورا کرتے ہیں کہ سماج کو محدثین کی بھی حاجت ہے تاکہ علوم حدیث کی حفاظت کی جاسکے، مفسرین بھی لازمی امر ہیں تاکہ قرآن حکیم کی حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا رہے ،مفتیان کرام بھی اہمیت کے حامل ہیں تاکہ عصری مسائل کی آسان تفہیم کے لئے اُن سے رابطہ کیا جاسکے، داعی و مبلغین بھی جزولاینفک ہیں کہ انہوں نے دین کی تعلیمات کو عملِ تبلیغ کے ذریعے پوری دنیا کے انسانوں تک پہنچانا ہے، حفاظ و قراحضرات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ اِن کے ذریعے قرات کا لب ولہجہ وعلوم تجوید ترویج پاتے ہیں۔ مختصراً کہا جائے کہ دین اسلام سے جڑے ہوئے کسی بھی ذریعہ علم کی حفاظت کے لیے مدارس کا وجود لازم وملزوم ہے کہ انہی کی بدولت یہ تمام منبعِ علوم آج کے انسان کی دسترست میں ہیں، جن سے انکار ممکن ہی نہیں۔

پھر سوال یہی اٹھتا ہے کہ اسقدر کثیر الجہتی کردار ادا کرنے کے باوجود بھی مدارس سے اور کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ جن کے پیش نظر انہیں موردِ الزام ٹھرایا جائے کہ وہ حقِ منصب پورا نہیں کر رہے، انہیں مزید پیش قدمی کرتے ہوئے فلاں فلاں علمی خلا پُر کرنا چاہیے تاکہ معاشرے کی اصلاح درست انداز میں کی جاسکے اور ایسے افراد تیار کیے جاسکیں جو ہمہ جہتی وصف کے حامل ہوں اور جنہیں سُرخاب کے پَر لگے ہوں کہ ایک وقت میں وہ فلاں ملک کے سیاسی مسلے کو حل کرنے کے لیے پرواز کریں اور جونہی وہاں سے فراغت حاصل کریں تو فوراً دوسرے ملک کے ایٹمی پلانٹ میں پیش آنے والے فالٹ کو دور کرنے کے لیے رختِ سفر باندھیں، پھر کسی اور ملک کی مزائل ٹیکنالوجی ممکنہ طور پر مطلوبہ اہداف حاصل نہ کرپارہی ہو تو انہی مدارس کے طلبہ وہاں جاکر اُسے درست کریں اور اگر کہیں حربی سازوسامان کی آمدورفت ہو تو یہی رجال کار وہاں بھی اپنی خدمات فراہم کریں۔

اگر ایسے تصوّرات و نظریات قائم کئے گیے ہیں تو اِن میں بنیادی خامی یہی نظر آتی ہے کہ اُن افکار کو گھڑنے والے افراد نے زمانہ حاضر کی درست تفہیم حاصل نہیں کہ آج کے دور میں کثیر الجہتی علوم میں کامل دسترست حاصل کرنا ممکن نہیں، یہ تخصصّات (specializations) کا دور ہے۔ کسی ایک شعبہ ہائے زندگی میں تخصص حاصل کیا جائے اور پھر اُسی میں بہتری و برتری کی تگ ودو جاری رکھی جائے تبھی جاکر اُس کے ممکنہ تقاضوں کو پورا کیا جاسکتا ہے ورنہ کارِ دیگر بیکاراست۔

اِسی بحث کا دوسرا پہلو بھی یہی ہے کہ مذکورہ بالا خدمات کے باوجود مدارس کے تعلیمی نظام میں ایسی کیا تبدیلی لائی جائے کہ وہاں سے بھی ایسے افراد تیار ہو کر نکلیں جو جدید دور کے تقاضوں کو بخوبی جانتے بھی ہوں اور اُن سے نبرد آزما ہونے کے لیے فکری و عملی طور پر مہارت تامہ رکھتے ہوں کیونکہ مشاہدہ عام کی بات ہے کہ اُن افراد کو دین کی تبلیغ کرنا آسان عمل ہے جنہوں نے مدارس سے علم حاصل کیا ہو یا اہل مدارس کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے ہوں کیونکہ وہ تمام تحدیات وسہولیات سے آشنا ہوتے ہیں لیکن عوام کی کثیر تعداد ایسی ہے جو مدارس یا نظام مدارس سے ہمیشہ کے لیے دور دور رہتی ہے۔ اُس کے پسِ پردہ حقائق کچھ بھی ہوں لیکن مسلمان ہونے کے ناطے انہیں دین کی تعلیمات سے آگاہی دینا ہر صاحب علمِ دین کا بنیادی فرض ہے اور اگر مخاطبین مسلمان نہ بھی ہوں تو امتِ دعوت ہونے کی نسبت سے دین کو اُن تک پہنچانا بھی مبلغین کا ہی فریضہ ہے۔

اور یہاں اصل مسلہ ہی اُن سے خطاب کرنے کا ہے کہ وہ اُس انداز میں میں بات سننے کو تیار نہیں ہوتے، جس انداز میں داعیین عمومی طور پر خطاب کرتے ہیں، وہ لوگ چونکہ دنیاوی علوم حاصل کرنے میں جُتے رہتے ہیں اور عصر حاضر میں دنیوی علوم حاصل کرنے کے جو مراکز ہیں وہیں دیگر کئی فتنے بھی پنپ رہے ہیں جیسا کہ

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

جمہوریت ازم، لبرل ازم، فاشزم، الحادپرست وغیرہ، جن کے افکار و نظریات اکثر اوقات اسلامی تعلیمات کے برعکس ہوتے ہیں اور اُن کی ذہن سازی اسقدر پختہ انداز میں کی جاتی ہے کہ وہ اسلام کا نام سنتے ہی بُدکنے لگتے ہیں۔ تو ایسے رجال سے طرزِ گفتگو کو تبدیل کرنا ہوگا، دلائل کو تراشنا ہوگا اور حقائق کو بروئے کار لانا ہوگا جو کہ اسلام کے بنیادی مصادر قرآن وسنت سے ہی اخذ کیے جا سکتے ہیں کیونکہ اُن مخاطبین کو اسلاف کے کارناموں سے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کیسا سرمایہ افتخار رہے اور اُن کی خدمات کا ڈنکا کہاں کہاں بجتا ہے؟ لہذا اس نقطہ نظر سے عصری تقاضوں کے مطابق مدارس کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ عوام میں بڑھتی ہوئی بے دینی کی لہر کو روکا جاسکے یا اُس کی شدت میں کمی لائی جاسکے۔ اس کے لیے چند تجاویز درجہ ذیل میں سپردِ قلم کی جائیں گیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن اُس سے قبل عصر حاضر کے احوال پر سرسری سی نظر ڈالنا قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

مبحث اول: عصر حاضر کے عناصر ترکیبی کی تفہیم

عمومی مشاہدہ ہے کہ انسان فطری طور پر غالب وحاکم افکار و نظریات کی طرف راغب ہوتا اور اُسی قوم کی تہذیب وثقافت کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے جسے وہ ذہنی لحاظ سے برتر و بہتر گردانتا ہے۔ تاریخ میں ایسا تسلسل سے ہوتا آیا ہے کہ جس قوم وملک نے دیگر اقوام وممالک پر غلبہ حاصل کیا، اُنہیں اپنے زیر نگین کیا، تو اُس فاتح قوم نے مفتوح قوم کے اوپر اپنی روایات واقدار کو اس قدر خوبنا کر پیش کیا کہ وہ قوم فکری و عملی لحاظ سے اُن کی گرویدہ ہوگئی۔ عصر حاضر میں بھی کچھ ایسا ہی منظر پیش نظر ہے کہ افراد معاشرہ اپنی مقامی روایات کو دقیانوسی اور فرسودہ قرار دے رہے ہیں اور اسلامی روایات سے انہیں گھِن آنے لگی ہے کہ یہ تو عربوں کی علاقائی روایات ہیں، اُن کا یہاں کچھ لینادینا نہیں لیکن اِسی کے ساتھ ہی مغربی اقوام کی روایات کو نہ صرف دل سے قبول کیا جارہا ہے بلکہ عملی طور پر اُس تہذیبی اقدار کے مطابق خود ڈھالا بھی جارہا ہے کیونکہ اُس میں جدت ہے، اُس میں ورائٹی ہے جو انسان کو موقع کی مناسبت سے خود کو تیار کرنے کی سہولت مہیا کرتی ہے، پھر اُس رسم وروایت کا تعلق خوراک سے ہو، پہناوے سے ہو یار ہن وسہن کے حوالے سے طرزِ زندگی کا ذکر کیا جائے سبھی اس تہذیب کی روایات کو اپنانا ہی راحتِ قلب وجاں کا ضامن گردانتے ہیں۔

اہلِ مدارس کے لیے یہ پہلو بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسلامی اقدار کو کیسے سماجی زندگی کا جزولاینفک بنایا جائے اور وہ نوخیز اذہان جو خود کی مسلم شناخت سے متنفر نظر آتے ہیں، انہیں کس طرح واپس اسلام کی روایات کی طرف لوٹایا جائے اور انہیں احساسِ یقین دلایا جائے کہ اسی میں اُن کی بہتری و برتری ہے کہ وہ سیرتِ نبوی ﷺ کے مطابق خود کو ڈھال لیں اور خوراک، لباس اور رہن وسہن کے حوالے سے نبوی طرزِ زندگی کو اپنائیں تاکہ ایک طرف وہ جہان بھر کی خرافات سے چھٹکارا پائیں گے تو دوسری طرف سادہ زندگی کو اپنانے سے بھی دیگر معاشی، جسمانی وذہنی فوائد بھی سمیٹیں گے کیونکہ ایک طرف انہیں سماجی سطح پر مقامی اقدار کو اپنانا پڑتا ہے، جب نصاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک منفرد طرزِ زندگی اُن کے سامنے آتی ہے اور ہمہ وقت سوشل میڈیا سے جُڑے رہنے کے سبب مغربی طرز ہائے حیات انہیں ذہنی طور پر اپنی طرف راغب کرتی ہے اور یہیں سے فکری خلجان بڑھنا شروع ہوتا ہے کہ جو وہ ہر لمحہ دیکھتے ہیں وہ انہیں عملی طور پر معاشرتی دباؤ کی وجہ سے وقوع ہوتا نظر نہیں آتا تو لاشعوری طور پر وہ اُس تہذیب کے خدوخال ڈھونڈتے ہیں تاکہ ذہنی آسودگی حاصل کر سکیں جو بے باقی، عریانی وفحاشی کے ذریعے سوشل میڈیا پر انہیں دیکھائی جاتی ہے۔ لہذا اس کے لیے پارلیمنٹ سے قانون سازی کروائی جائے، ایسی ایپلی کیشنز بنائی جائیں جو اسلامی ومقامی روایات کی درست ترجمانی کر سکیں اور انہیں ہی الیکٹرانک میڈیا پر فروغ دیا جائے۔

مبحث دوم: تعلیمی مراتب کی تفہیم

نظام تعلیم بھی معاشرتی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت رکھتا ہے۔اسی کی بدولت کسی قوم کے ماضی کی جھلک،زمانہ حال کی تفہیم اور درخشاں مستقبل کی تیاری نظر آتی ہے کہ وہ قوم کس قدر اسلاف سے نسبت رکھتی ہے اور اُن کی بتلائی و سِکھلائی گئی اقدار کی امین ہے اور اُن کی روشنی میں اپنے موجودہ وقت کو بہتر طور پر استعمال کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے اور زمانہ ماضی و حال کے تجربات سے کیا کچھ اخذ کر کے مستقبل کو سنوارے کی حکمت عملی ترتیب دے رہی ہے۔یہ تمام تر لائحہ عمل نظام تعلیم کے ذریعے مرتب کیا جاتا ہے لیکن یہاں پر بھی نصاب میں طرفین کا تفاوت غالب دیکھائی دیتا ہے کہ ایک سرکاری سطح پر رائج ہے اور ایک نصاب پرائیویٹ سطح پر، پھر پرائیویٹ نظام تعلیم بھی مزید کئی طرح کے نصاب میں الجھا ہوا ہے کہ کہیں آکسفورڈ اور کہیں کیمرج، کہیں ہاورڈ اور کہیں بیکن وغیرہ۔اسی نظام کی ایک اور تہہ بھی ہے جس میں پرائیویٹ سطح پر اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے مدارس کی شاخیں ہیں جہاں پر چار مختلف فقہی پسِ منظر رکھنے والے مکاتب نظر آتے ہیں جن پر فرقہ واریت کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے۔

تو وہ نوخیز ذہن جو ابھی اِن مذکورہ نظام ہائے تعلیم کو نہیں جانتا وہ کیسے فیصلہ کر پائے گا کہ اُس نے کہاں داخلہ لینا ہے اور کیوں لینا ہے اور اگر داخلہ لینا ہے تو کن اہداف و مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر لینا ہے اور بعد از فراغت،جب سند حاصل کی جائے گی تو مستقبل کے حوالے سے کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں؟ خدشات کا ایک لا متناہی سلسلہ ذہنی سطح پر اُمڈ آتا ہے جن کے تدارک کے لیے کسی بھی فریق کے پاس تسلی بخش حل موجود نہیں کیونکہ سبھی نے ایک دائرہ کھینچا ہوا ہے اور اُسی میں سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور ستم بالائے ستم کہ اِسی عمل کو خود کے لیے نجات دہندہ قرار دیتے ہیں۔

اہل دانش کو اس مسلہ کے تدارک کے لیے متفقہ حل تلاش کرنا چاہیے اور ایک جامع لائحہ عمل مرتب دینا چاہیے جس کے ذریعے یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ سکنڈری سطح کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد طالب علم کس قابل ہو جائے کہ اسے صحیح و غلط میں فرق کرنا آجائے،انٹر میڈیٹ کا طالب علم روزگار چلانے کے قابل ہو جائے کہ بعض والدین یہاں تک خاصی مشکلات جھیلنے کے بعد اولاد کا تعلیمی خرچ اٹھا پاتے ہیں اور اگر اٹھارہ سے بیس سال کی عمر کا بچہ صرف اسناد ہی حاصل کر پایا ہے اور عملی طور پر کورے کاغذ کی طرح ہے تو اُن اخراجات کا محاصل کیا ہوا۔عالم فاضل یا یونیورسٹی سطح پر طے ہونا چاہیے کہ کتنی تعداد میں سائنسدان چاہیے،ڈاکٹر چاہیے، پائلٹ وانجئینیز چاہئے یا مفتی، محدث، مفسر یا فقہی معاملات میں تدبر کرنے والے چاہیے اور باقی ماندہ کی کس میدان عمل میں کیا کھپت ہے۔یہ سب و دیگر تمام معاملات کو نصاب کا حصہ بنایا جانا چاہیے اور ملکی سطح پر حکومت کی طرف سے آگاہی مہم اداروں کی مدد سے چلائی جانی چاہیے کہ اس سال اتنی تعداد میں فلاں میدانِ کارزار میں رجال کار کی ضرورت ہے تاکہ ادارے اُسی تناسب سے طلبہ کی تیاری کروا سکیں۔

مبحث سوم: معاشرتی یا سماجی تقسیم

معاشرہ! افراد، خاندان، اقوام و قبائل کی مروّجہ روایات کا عکس ہوتا ہے جس کے ذریعے اُس سماج میں پنپنے والی اقدار کی قدر و قیمت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں علم کو ترجیح دی جاتی ہے،معیشت کو زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے،سیاست کا موضوع محور و مرکز ہے یا جنگ و جدل کا چلن عام ہے۔یہ تمام و دیگر غیر مذکورہ پہلو سبھی ایک سماج یا معاشرے کی اجتماعی زندگی کا جزو لاینفک ہیں اور انہی کے مرہونِ منت معاشرہ ترقی و تنزلی کی منازل بھی طے کرتا ہے۔عمومی طرزِ تدریس یہی ہونا چاہیے کہ ایک طالب علم جب مدارس یا جامعات سے سند تفضیل حاصل کر کے فارغ ہوتا ہے تو اُسے سماجیات سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ اپنے ارد گرد وسائل و مسائل سے

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

بآسانی نبر آزما ہو سکے لیکن مشاہدہ اس پر شاہد ہے کہ ایک طالب علم معاشرتی وجود سے کامل طور پر نابلد ہوتا ہے۔اُسے نصابی صورت میں جو معلومات منتقل کی جاتی ہیں ، عملی زندگی میں اُن کا طلاق خاصا کم دیکھائی دیتا ہے۔

نہ اُسے ملکی اداروں کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ کس ادارے کی کیا ذمہ داری ہے، نہ اُسے ملکی ضروریات سے آگاہی ہوتی ہے کہ اس وقت ملک میں کس ہنر کی طلب زیادہ ہے یا کس کام کو یکسر نظر انداز کرنا ہے اور نہ ہی اسے علاقائی مسائل سے کوئی سروکار ہوتا ہے کہ یہاں کہ لوگ کن مشکلات سے دوچار ہیں تا کہ اُن کا حل نکالا جا سکے اور یہ ذمہ داری طلبہ پر عائد ہوتی ہے کہ وہ جامعات سے سماجی مسائل کا حل ڈھونڈ کر ساتھ لائیں اور جیسے ہی عملی زندگی میں قدم رکھیں، ایک نسخہ کیمیا اُن کے ہاتھ میں ہو جس سے لوگوں میں شفا بانٹنے کا کام لیں لیکن یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ جب عملی طور پر مصائب کا سامنا کرتے ہیں، کہیں فائدہ ہوتا ہے اور اکثر کا زیادہ تر نقصان سے واسطہ پڑتا ہے، ٹھوکریں کھاتے کھاتے کچھ عرصہ بعد کسی کو مطلوبہ کام مل جاتا ہے اور اکثریت کسی اور میدان کارِزار میں پنجہ آزمائی کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتی ہے اور عمومی چلن ملازمت کا حصول یا بیرونِ ملک روزگار کی تلاش میں رختِ سفر باندھنا ہوتا ہے تا کہ روٹی روزی سلسلہ چل نکلے۔

مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے بھی زندگی پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوتی، اکثریت کا کانٹوں بھرے راستے سے واسطہ پڑتا ہے کہ کچھ کا روزگار مسجد کی امامت سے منسلک ہو جاتا ہے، قلیل تعداد درس تدریس میں مصروف ہو جاتی ہے، کچھ فن زبان وبیان میں جُت جاتے ہیں اور کچھ قلم وکتاب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں لیکن اِن تمام کے ساتھ قدرِ مشترک مالی مشکلات کا معاملہ ہے۔ حقیقت حال سے جتنا بھی انکار کیا جائے تو بھی ممکن نہیں کہ جس طرح کی مسائل علما کرام کو درپیش ہوتے ہیں ویسے شائد دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوں، سب سے کم تنخواہ، سب سے کم ذرائع ووسائل کا دستیاب ہونا اور انہاتی ناگفتہ بہ حالات میں خاندان کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہونا ہے اور اِن تمام مسائل سے سامنا بعد از تحصیل ہوتا ہے جہاں سے ذہنی وجسمانی آزمائشوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے حوالے سے طلبہ کو کبھی بھی جامعات میں تیاری نہیں کروائی جاتی لہذا سماجی تقسیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سبھی طلبہ کو تربیت دی جائے کہ جس کے جو مسائل ہیں وہ اُنہی کے مطابق خود کو تیار کرے تا کہ بروقت خاندانی وسماجی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو اور اس معاشرے میں کہ جس کی تقسیم در تقسیم کا ایک گھمبیر جال بچھا ہوا ہے جیسا کہ سیاسی تقسیم، قومی تقسیم، لسانی تقسیم، ملکی تقسیم، صوبائی تقسیم، علاقائی تقسیم، گروہی تقسیم، جماعتی تقسیم، مسلکی تقسیم، مذہبی تقسیم، معاشی تقسیم اور مفاداتی تقسیم وغیرہ سے بچتے ہوئے ایک مفید شہری بھی بن سکے اور عائد فرائض کو بھی بخوبی ادا کر سکے۔

مبحث چہارم: مدارس کو درپیش مسائل کا جائزہ

معاشرتی سطح پر مدارس کو عمومی طور پر دو طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ایک کا تعلق ان افراد سے ہے جو مدارس کے انتظامی امور سے منسلک ہیں اور دوسرا پہلو اُن طلبہ کے حوالے سے ہے جو ان مدارس سے فارغ التحصیل ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ جب بات مدارس کی جائے گی تو اس میں کسی مکتبہ فکر کو مستثنا قرار نہیں دیا جاتا کہ وہ مدرسہ کسی بھی مکتبہ فکر کا ہو، اِس فہرست میں شامل کیا جاتا ہے، عام طور پر یہی غلطی دوہرائی جاتی ہے کہ چونکہ فلاں مدارس کسی اور مکتب سے منسلک ہیں لہذا انہیں شمار نہیں کیا جانا چاہیے یا اُن مدارس کے مسائل کو ہمارے مدارس کے مسائل کے ساتھ نہ جوڑا جائے لہذا یہ قدرِ مشترک ہے کہ تمام مدارس کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تا کہ یکساں طور پر مسائل کا حل نکالا جائے۔ لہذا مدارس کی اانتظامیہ کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں اُن کا مختصر سا تذکرہ درجہ ذیل میں ہے۔

1۔مالی استعانت

ماضی کی نسبت آج مدارس کو مختلف مالی وسائل کا سامنا ہے۔پہلے صرف رہائش، کھاناودیگر ضروری اخراجات کاانتظام کیاجاتا یقینی بنایاجاتا تھااوراس کے ساتھ سرکاری سطح پر بھی تعاون پیش پیش ہوتا تھااب جبکہ عصر حاضر میں سرکاری سرپرستی کی سہولت میسر نہیں رہی اوراس کے ساتھ ساتھ دیگراخراجات جیسا کہ بجلی کے بلزاور اگر کھاناپکانے کا مقامی سطح پرانتظام کیاگیاہو تو گیس کے بلزاوراس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کرام کی تنخواہ وغیرہ اور دیگراخراجات کا بروقت اور ہمہ وقت پورا کرناایک دشوار گزار مرحلہ بن گیاہے کہ طلبہ کی کثیر تعداد آج بھی اِنہی مدارس میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہورہی ہے لیکن دورِجدید کے تقاضے خاصی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں کہ ایک طرف انتظامی معاملات کواحسن انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے اور دوسری طرف نظم وضبط کو قائم رکھتے ہوئے حفاظتی انتظامات کو بھی یقینی بنانا ہے تاکہ والدین کی طرف سے جو بھاری ذمہ داری اِن مدارس کی انتظامیہ پر عائد کی گئی ہے اُس سے بخوبی نبرآزماہوا جاسکے کہ کسی انہونی کی صورت میں تنقید کے نِشتر چلانے والے بلاحیل وحجت اور تحقیق کے تمام مدارس کی عزت وتکریم کواچھالنااپناپیدائشی حق گردانتے ہیں اوراسی کارِہائے خباثت سے انہیں اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔

لہذا!اہلِ مدارس کوایک الگ اور منفرد اندازہائے طرزِ معاش اپنانا ہوگا،ایسے منصوبے زیرِغورلانے ہوں گے اورایسے کورسز ڈیزائین کرنے ہوں گے جن کے ذریعے اپنے اخراجات کو پورا کیاجاسکے۔لوگوں کی مالی امداد سے صرف نظر کرتے ہوئے آمدن کے جدید ذرائع اختیار کرنے ہوں گے تاکہ ایک طرف طلبہ کی تخلیقی صلاحیتیں بھی نکھرتی جائیں، عملی میدان میں کام کرنے کے لیے بھی تیار ہوتے جائیں، صرف محراب ومنبر اور مسجد انتظامیہ کے صدقات تک محدود نہ رہیں بلکہ خود کی کمائی سے دین کی اشاعت وتبلیغ میں مفید کردارادا کرنے کے بھی قابل ہوجائیں اور لوگوں کے اِس رویّے وسوچ کو یکسر تبدیل کردیں کہ اہل مدارس لوگوں کی ہاتھ کی میل پر گزارہ کرتے ہیں ،انہیں کام کاج کچھ نہیں آتا، پھر جو بات ہوگی ، بہتر انداز میں سنی جائے گی، پھر علما کرام ہر ماہ کے اختتام پر انتظامیہ کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے دینے والے بننے لگیں گے اور آئے روز کے ذہنی وجسمانی تشدد سے چھٹکارہ ملتا جائے گااور یہ سب تبھی ممکن ہوپائے گا جب اجتماعی طور پر عملی کاوشیں بروئے کار لائی جائیں گیں اورانہیں باہم مربوط کیا جائے گا کہ زنجیر، ایک ایک کڑی سے مل کر بنتی ہے اور پھر بڑے سے بڑے بوجھ کو بھی سہارا دینے کے قابل ہو جاتی ہے اور رب تعالیٰ کافرمان بھی ہے کہ

وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی[1]

اور نیکی اور پرہیزگاری پرایک دوسرے کی مدد کرو

لہذااس سے بڑھ کر تعاون کی بہتر صورت کونسی ہوگی کہ مدارس کوخود کفیل بنایاجائے اورانہیں چندوں اور خیرات جیسے ذرائع سے یکسر آزاد کردیاجائے تاکہ وہ وپنی پوری قوت دین کی تعلیم حاصل کرنے اورانہیں فروغ دینے پر صرف کردیں۔

مبحث پنجم: فارغ التحصیل طلبہ کو درپیش مسائل

1۔بے دینی کی اٹھتی لہر

1۔المائدہ 5 :2

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

مدارس سے تربیت یافتہ افراد کو عصر حاضر میں الحاد جیسے دیگر نظریات کا سامنا ہے۔ایک طرف سوشل میڈیا و مخلوط ماحول کے تحت پروان چڑھتی نئی نسل کا دین سے بیزاری کا اظہار کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے تو دوسری طرف جامعات میں ایسی فکر کی آبیاری کی جا رہی ہے جو دین و مذہب سے دوری اختیار کرنے کا سبب بنتی ہے،ایسے افراد کو فروغ دیا جاتا ہے جو دینی معاملات کو سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے اور طلبہ کو بھی قائل کیا جاتا ہے کہ دین میں اتنی سختی نہیں ہے جتنی بیان کی جاتی ہے۔پردہ کرنے کے حوالے سے غیر ضروری دباؤ ڈالا جاتا ہے ورنہ حقیقت میں یہ اتنا ضروری نہیں، جنت پر حق صرف مسلمانوں کا نہیں، دنیا میں جتنے بھی خیر کے کام کر رہے ہیں،اُن کا تعلق چاہیے کسی بھی مذہب سے ہو، جیسا بھی اُن کا طرز زندگی ہو، وہ بھی جنت میں جانے کے مستحق ہیں لہذا یہ صرف مولویوں کی طرف سے بنایا گیا پروپیگنڈا ہے کہ جنت میں صرف مسلمان ہی جائے گا اور کوئی نہیں۔ جتنا ضروری غیر اقوام کا لٹریچر پڑھنا ہے،اُتنا دیگر اسلامی علوم نہیں کہ یہ تو عام سی بات ہے، کہیں سے بھی دیکھ کر پڑھا جا سکتا ہے حتیٰ کہ مختلف اپلیکیشنز سے بھی استفادہ اٹھایا جا سکتا ہے لہذا اس کے لیے لیکچرز مختص کرنا از حد ضروری نہیں۔ مذکورہ بالا و اسی طرز کے دیگر افکار کی بہتات ہوتی ہے جامعات میں۔

جبکہ یہ معاملہ اور بھی سنجیدہ ہو جاتا ہے جب اُسی ڈیپارٹمنٹ یا ادارے میں سرکاری طور پر تعینات اساتذہ کی طرف سے بار بار دوہرایا جائے تو طلبہ کے لیے اُن پر یقین کرنا ایک فطری عمل ہے لہذا! مطمح نظر صرف یہ نہیں کہ علمی سطح پر نقلی و عقلی انداز سے اُن کا رُد کر دیا جائے اور تقاریر میں عوام الناس کو خبردار کر دیا جائے بلکہ اُن افکار و نظریات کو نصاب میں کسی حد تک شامل کیا جانا چاہیے۔ سیمینارز اور ورکشاپس منعقد کی جانی چاہیے اور جتنی شدت اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے مخالف قوتیں میدان عمل میں ہیں، مدارس کی طرف سے بھی جدید تقاضوں کے مطابق زبان و بیان کو بروئے کار لایا جانا چاہیے تا کہ نہ صرف بر وقت اُن کا تدارک کیا جا سکے بلکہ اُن کی طرف نوخیز اذہان کی بڑھتی ہوئی رغبت کا بھی قلع و قمع کیا جا سکے کیونکہ فرمان نبوی ﷺ ہے کہ

خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ[2]

لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہو۔

لہذا خیر کا دروازہ کھولنے کی ذمہ داری اہل مدارس کے کندھوں پر ہی آن پڑی ہے کہ جب بھی کوئی شر، سر اٹھانے لگے تو بر وقت اس کا تدارک کیا جائے اور ایسا خیال بھی محال نہیں ابھی تک اہل علم کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں کی گئی بلکہ اس بھاری ذمہ داری کو بہت پہلے سے نبھایا جا رہا ہے لیکن اُس طرز عمل میں ہمہ جہتی کی کمی دیکھائی دیتی ہے جسے اب دور کیا جانا چاہیے۔

2۔ حلال و حرام کا مٹتا ہوا فرق

نئی نسل میں رزق کے حوالے سے حلال و حرام کی تمیز مٹتی جا رہی ہے۔انہیں یہ یقین دلا دیا گیا ہے کہ رزق صرف پیسہ کی صورت میں ہی کمایا جا سکتا ہے اور اُس کے لیے ہر حربہ آزمائے جانے کے قابل ہے پھر چاہیے اُس کا تعلق منشیات سے ہو، ادویات میں ملاوٹ کرنی ہو یا خوردنی اشیا میں زہریلا مواد ملایا جانا ہو، منڈی میں بیٹھ کر بھاؤ و تاؤ کرنے کا اختیار ہوتے ہوئے ضروری اشیا کی قیمت میں اضافہ کرنا ہو یا پوری قیمت وصول کرنے کے باوجود ناقص اشیا جیسا کہ ریڑھی والے کا پھلوں کو فروخت کرنا یا پیٹرول پمپ سے پیٹرول بھروانا ہو کسی بھی سطح پر متعین معیار و مقدار کے مطابق چیزوں کا حصول ممکن نہیں۔

2۔امام جلال الدین السیوطی۔الفتح الکبیر۔بیروت: دار الفکر 2003ء۔حرف الخا،ج2،ص93،رقم الحدیث 1649۔

اور یہ تمام افراد یا ذرائع کسی بھی لحاظ سے مدارس کے زیر تربیت پروان نہیں چڑھے ہوتے۔ کسی نے مدرسہ یا سکول کی عمارت بھی نہیں دیکھی ہوتی، کوئی ثانوی تعلیم کو ہی پورا کر پاتا ہے اور کوئی جامعات سے اعلیٰ اسناد حاصل کرنے کے باوجود حلال و حرام میں تمیز کرنے کے وصف سے نابلد ہوتا ہے کیونکہ وہاں صرف معیشت کو بڑھاوا دینے کے طریقے ازبر کروائے جاتے ہیں، جن کا سرِ سے حلال واحرام یا احساس وجذبات سے چنداں تعلق نہیں ہوتا، انہیں صرف منافع کا حصول ممکن بنانا سکھایا جاتا ہے جس کے لیے ہر حربہ بروئے کار لایا جانا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

اسی موضوع سے جڑا ہوا ایک اور پہلو بھی ہے کہ سوشل میڈیا کے ذریعے مختلف ذرائع آمدن بھی ایجاد ہو چکے ہیں جیسا کہ ای کامرس، فری لانسنگ، مختلف ویڈیوز کو دیکھتے رہنا جسے واچ ٹائم کہا جاتا ہے اور یوٹیوب پر چینل بنا کر الٹ بٹانگ حرکتیں کر کے متبعین(Followers) کو بڑھانا تا کہ ایک مخصوص تعداد پوری ہونے کے بعد آمدن کا ذریعہ شروع ہو جاتا ہے۔ نوخیز اذہان کو اس بارے میں آگاہی دینا بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ان ذرائع میں سے کونسا ذریعہ ایسا ہے کہ جسے اختیار کیا جائے تو حاصل ہونے والی آمدنی حلال گردانی جاسکتی ہے اور کن کن ذرائع سے وصول ہونے والا پیسہ حرام کے زُمرے میں آتا ہے تا کہ حلال و حرام کا فرق واضح تر ہو جائے۔

یہ تمام پہلو ایک دینی مدرسہ سے تعلق رکھنے والے فرد کے ذمہ ہیں کہ وہ اپنے سماج کے عُرف سے نہ صرف آشنا ہو بلکہ اُس کے تمام نشیب و فراز سے بھی آگاہی حاصل کرے کہ ایک طرف وہ دوسروں کو رہنمائی فراہم کر سکے اور دوسری طرف خود کی بھی اصلاح کرتا چلا جائے کہ فتنے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے جگہ بناتے ہیں اور راسخ ہونے کے بعد تباہی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں، جن سے جان خلاصی کروانا پھر آسان مرحلہ ہر گز نہیں ہوتا۔

3۔ روایتی سیاست میں معاون بننا

اہل مدارس کے لئے سماجی سطح پر میدان سیاست میں شمولیت اختیار نہ کرنا یا کہیں اختیار کی جائے تو روایتی سیاست کے طور طریقوں کے مطابق خود کو بھینٹ چڑھا دینا بھی ہے کہ جیسے دیگر سیاستدان مصروفِ عمل ہیں ویسا ہی طرز زندگی اپنا لیا جائے جبکہ دونوں کے طریق میں زمین و آسمان کا فرق ہونا چاہیے۔ کیونکہ روایتی سیاستدان مقامی، علاقائی یا ملکی سطح پر موجود سیاسی جماعتوں سے الحاق کر کے انہیں کے طرزِ سیاست کو ہی اختیار کریں گے اور اسی کا دفاع و فروغ دینے کے لیے فنڈنگ اکٹھی کرنا و ترغیب دینے جیسے عوامل بروئے کار لائیں گے۔ یہ طریقہ سیاست اس وقت عالمگیر شکل اختیار کر چکا ہے کہ سیاسی جماعتوں کو مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ممبران اپنی اپنی استطاعت یا حلقہ انتخاب کے مطابق جمع کر کے جماعت کے سربراہ کو پیش کرتے ہیں اور اس طرح سیاسی معاملات چلائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف وہ صاحبان دولت و ثروت کہ جن کے مفادات سیاسی جماعتوں کی حکومت کے ساتھ نتھی ہوتے ہیں، انہیں بھی اِس کارِ بیکار میں چار و ناچار شامل ہونا پڑتا ہے کہ گھوڑا اگر گھاس سے دشمنی کرے گا تو پھر کھائے گا کیا؟ کی مثل اُن کی بقا و عافیت اسی میں مضمر ہوتی ہے کہ برسرِ اقتدار سے استفادہ حاصل کیا جائے۔

مذکورہ بالا طرزِ سیاست عالمگیر نوعیت کا ہے کہ چاہیے جمہوری نظامِ حکومت کا علمبردار ہوں یا شاہی تماشا ہو سبھی کی طبیعت کو یہی بھاتا ہے لیکن وہ علما کرام جو انبیا کرامؑ کے علوم کے وارث ہیں، جنہوں نے عقلی و نقلی علوم میں کامل دسترست حاصل کی ہوتی ہے، جنہیں مخلوقِ خدا کی خدمت بھی کرنی ہے اور خوفِ خدا کا دامن بھی تھامے رکھنا ہے، اُن کا طرزِ سیاست تھوڑا الگ اور منفرد قسم کا ہونا چاہیے۔ اس مذکورہ راستے میں انگنت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کہ سماج کی فلاح میں طعنے بھی سننے پڑتے ہیں اور پتھر کھا کر بھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ عزت نفس کی بَلی بھی دینی پڑتی ہے اور اغیار کی طرف سے کھڑی کی گئی رکاوٹوں کو خوشدلی سے عبور کرنا ہوتا ہے۔ یہ کانٹوں بھرا راستہ ہوتا ہے جس پر عزم صمیم رکھنے والے ہی مستقل مزاجی سے اور بارگاہ خداوندی سے عطا ہونے والی استقامت کے سبب ہی منزل مقصود کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن یہ تمام مراحل چنداں آسان نہیں ہیں اور اگر کوئی صالح طبیعت ان راستوں پر سے گزرنے میں کامیاب

ہو جائے تو امید واثق ہے کہ آخرت کے اجر و ثواب کا اندازہ لگانا ممکنات میں سے نہیں۔ لہذا! پیش نظر الفاظ کی صورت میں، اہل علم سے مؤدبانہ التماس کی جاتی ہے کہ روایتی سیاست کا ہرگز حصہ نہ بنا جائے اور نہ ہی ایسے کردار کے سبب خود کی ذات کو داغدار کیا جانا چاہیے۔

4۔ سماجی مقاطعہ کا بڑھتا ہوا رجحان

عصر حاضر میں دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ایک اہم و بنیادی مسلہ نوخیز اذہان کا سماجی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا غالب ہوتا رجحان بھی ہے کہ نسل نو کو اِسی میں خود کی ذات کی عافیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کے اسباب و ذرائع مختلف و متضاد ہو سکتے ہیں جیسا کہ خاندانی مسائل وغیرہ کہ روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آنے سے بعض نوجوان مایوسی کا شکار ہو کر گوشہ تنہائی تلاش کرنے لگتے ہیں اور ناکامی کی صورت میں کسی المناک حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، بعض اوقات مالی مشکلات کی وجہ سے لوگ ضروریات و خواہشات کی تکمیل نہ ہونے کے سبب بھی ذہنی مسائل میں الجھ جاتے ہیں، بیروزگاری بھی اعصاب شل کر دینے والی آزمائش ہے اور دین سے لاعلمی جیسا عُنصر بھی اپنے گھمبیر اثرات سے گھائل کیے جا رہا ہے۔

ایسے میں اہل دارس کے کندھوں پر اجتماعی طور پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایسے مراکز قائم کیے جائیں جن پر کسی خاص مکتبہ فکر کی چھاپ نہ ہو اور وہاں پر بلا نسل و رنگ لوگوں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں علاج کیا جائے۔ بلاشبہ عصری علوم جیسا کہ علوم نفسیات نے بھی کونسلنگ کے نام پر ایسا شعبہ متعارف کروایا ہوا ہے جس کے ذریعے لوگوں کو حوصلہ دیا جاتا ہے اور زندگی سے مایوس ہو جانے والوں میں امید پیدا کی جاتی ہے کہ وہ ایک مفید انسان کے طور پر کارہائے حیات سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور بہتر طور پر اپنا کردار نبھا سکتے ہیں بعینہ اہل اسلام کو بھی کوئی طریقہ ہائے عمل اپنانا چاہیے جس کے ذریعے زندگیوں میں امید کی شمع روشن کی جا سکے جبکہ اسلام کا واضح پیغام ہے کہ

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ[3]

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا

تو جن کے پاس پیغام الٰہی ہو، سنت رسول اللہ ﷺ ہو، آثار صحابہ کرامؓ سے رہنمائی میسر ہو اور فرامین اسلاف کا گراں قدر سرمایہ ہو پھر بھی اُن کے پاس لوگوں کی دلجوئی کے لیے بہتر حکمت عملی نہ ہو، یہ بڑی اچنبھے کی بات ہو گی۔ لہذا! ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جانا چاہیے جس کے ذریعے سے افراد معاشرہ کو عملی طور پر پیغام دیا جا سکے کہ انہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، خاندانی یا سماجی مسائل سے گھبرا کر خودکشی کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ متعلقہ مقام پر افراد سے رجوع کیا جائے، بہتری کی گنجائش بہر حال موجود ہو گی۔

5۔ فکری انحطاط

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور اس کے ماننے والوں کی تعداد دنیا میں دوسرے درجے پر ہے۔ بحکمِ الٰہی، اسے فطری دین بھی کہا جاتا ہے اور مقالہ نگار کے فہم کے مطابق فطری دین صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں تمام انسانوں کی ہر قسم کی رہنمائی کے لئے ہدایات کا مجموعہ موجود ہو اور وہ دین و دنیا کے کسی بھی کونے میں رہنے والے انسان کو ویسے ہی رہنمائی فراہم کرے جیسے گنجان آباد علاقے میں رہنے والے افراد کو مہیّا کرتا ہے۔ اُس کی مصدری تعلیمات میں ذرّہ برابر بھی کمی و بیشی واقع نہ

3۔ الذمر 39 :53

ہوئی ہو حتیٰ کہ اِس کی اتباع کرنے والوں کے علاوہ جو اسلام کی تعلیمات پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے، وہ بھی استفادہ کرنا چاہیں تو بلا حیل و حجت مستفید ہو سکتے ہیں، اُنہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے مثبت نتائج بہر حال حاصل ہوں گے جیسا کہ اقوام مغرب میں جانوروں کا گوشت حاصل کرنے کے لیے انہیں ذبح کرنے کا ویسا طریقہ مروج نہیں ہے جیسا کہ اسلام نے بتلایا ہے، وہ جس طریقے سے جانوروں کو حلال کرتے ہیں، اسے ناقص عمل گردانا جاتا ہے کہ اُس کے ذریعے فاسد مادے جانور کے وجود سے ہر گز خارج نہیں ہوتے اور ایسا گوشت کھانے والے فوائد کی بجائے الٹا مضرِ صحت بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو کہ مزید کئی جسمانی وذہنی مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

دین اسلام کے فطری ہونے کا درست معنی یہاں اس پہلو کے لحاظ سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مغربی اقوام اسلام کے پیغام کو قبول کریں یا نہ کریں لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر دنیوی فلاح حاصل کر سکتے ہیں، بیماریوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، فاسد مادوں سے پاک گوشت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی مسائل سے بچ سکتے ہیں۔ اور یہی ایک فطری دین کی خاصیت ہوتی ہے اُسے کوئی فرد قبول کرے یا نہ کرے لیکن اُس کی بتلائی ہوئی حکمت بھری باتوں سے استفادہ بلا رنگ ونسل سبھی کر سکتے ہیں اور کسی کے نتائج میں بھی ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آئے گا۔

لہذا! یہ وہ پہلو ہے جو دینِ اسلام نے تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر اپنایا ہوا ہے، کسی کے لیے بھی ممانعت واجازت لینے کی قید نہیں لگائی گئی لیکن متبعین کی حالتِ زار کسی اور منظر کی عکس بندی کرتی نظر آتی ہے۔ قول علامہ اقبالؒ

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک۔ ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرَم پاک بھی، اللہ بھی، قُرآن بھی ایک۔ کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

مسلمانوں کی اسی فرقہ بندی و فرقہ پرستی کے سبب پیدا ہونے والے مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا کہ

شور ہے، ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود!
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود۔ یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو۔ تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

اور امت کے زوال کا اسباب بھی واضح کیا کہ آج اگر مسلمان زمانے بھر میں رسواہ ہوتے پھر رہے ہیں تو اس کے پسِ پردہ حقائق کیا ہیں جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے۔ تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے!
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے۔ تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر۔ اور تم خوار ہوئے تارکِ قُرآں ہو کر

قصہ مختصر کہ آج بھی فکری انحطاط کا علاج اِسی اسلام کی تعلیمات میں پنہاں ہے۔ علام الغیوب نے جو ہدایات اپنے ماننے والوں کے لیے نازل فرمائی ہیں، وہی نہ ماننے والوں کے لیے بھی ہیں اگر انہیں بھی کامیابی حاصل کرنی ہے تو اُس کے لیے بہترین طرز عمل اسواہ حسنہ کی صورت میں محفوظ ہے اور یہی طریقہ ہائے زندگی

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

مسلمانوں کو بھی اپنانا چاہیے، آپس کے اختلافات کا حل نکالنا چاہیے اور ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے تاکہ اخوت و مودت کا ماحول پروان چڑھایا جا سکے اور اجتماعی کاوشیں بروئے کار لائی جائیں تاکہ اصلاح معاشرہ کا سفر تیز تر ہو جائے اور اس کے لیے صرف ایک ہی نسخہ کیمیا کہ

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں۔ یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں [4]

لہذا! خود کی ذات میں مقید رہتے ہوئے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے مذہبی و مسلکی سطح پر موجود افراد سے مل مفادِ عامہ کے پیش نظر ایک وسیع مسجد بنائی جائے جس میں لوگوں کے فکری مسائل بھی حل کیے جائیں اور اجتماعی زندگی سے مطلق الجھنوں و پریشانیوں کا بھی قلع قمع کرنے کی کاوشیں بھی بروئے کار لائی جائیں۔

6۔ اسلاف پسندی و اسلاف پرستی میں فرق کا تعین

مقامی سطح پر یہ رواج پروان چڑھ چکا ہے کہ ہر مکتبہ فکر کے اکابر ہمیشہ ہی درست راہ کے متلاشی و پیروکار رہے ہیں اور اُن سے غلطی سرزد ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ اسلاف میں سے ہیں اور ان کی وسیع علمی و تصنیفی خدمات ہیں لہذا اُن پر نقد نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس دعوی کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر آپس کے اختلافات ہی جنم نہیں لیتے کہ جب اسلاف نے بغیر کسی تفریق کے علمی کارنامے سرانجام دیے ہیں جو کہ سارے کے سارے شرعی لحاظ سے درست ہیں تو آج اُن میں اختلاف کیسے پیدا ہو گیا کہ انہوں نے سبھی کچھ شریعت کی روشنی میں بیان کیا ہوا ہے اور شرعی تعبیرات میں تطبیق کے لحاظ سے مسائل تو ہو سکتے ہیں لیکن تغلیط کا عنصر نمایاں نہیں ہوتا کہ تغلیط کو شرعی اساسیات کے برخلاف جانا جائے گا۔

لہذا! دین و مسلک کی خدمت کے لیے دوسرے مکاتیب فکر کے اسلاف کو خلاف اسلام شمار نہیں کیا جانا چاہیے کہ سبھی کے اسلاف مؤقر و محترم ہیں کہ انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق دین کی خدمت کی اور دوسرے لوگوں تک پیغام دین پہنچایا اور اگر کسی سلف کے حوالے سے اختلافی نقطہ نظر پایا جاتا ہے تو اُن کے بارے میں یکبار فیصلہ کر لیا جانا چاہیے کہ انہوں نے دین کی اساسیات کو مضبوط کیا ہے یا کمزور، اگر مضبوط کیا ہے تو اُن کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے اور اگر کمزور کیا ہے تو اُن کی علیحدہ فہرست مرتب کی جانی چاہیے کہ اِن اسلاف کے افکار و نظریات کی ترویج نہیں کی جانی چاہیے تاکہ مستقبل میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تصانیف کی قدر و قیمت کم ہوتی جائے اور اہل علم اُن سے لاعلم ہوتے جائیں۔ لیکن یہ عمل کسی ذاتی بغض و حسد اور عناد شامل نہیں ہونا چاہیے کہ چونکہ فلاں شخص نے زمانہ ماضی میں فلاں مکتبہ فکر کے خالف کھل کر تنقید کی تھی لہذا اُسے فروغ دیا جائے تاکہ مخالفین کی تذلیل کی جا سکے یا انہیں نیچا دیکھانے میں کارگر ثابت ہو۔ علی ہذاالقیاس! کہ اسلاف پسندی کی روایت کو برقرار رکھا جانا چاہیے اور اسلاف پرستی کی مذمت کی جانی چاہیے تاکہ علم سے نسبت برقرار رہے اور اشخاص کو انہی علوم کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔

7۔ آپسی اختلافات کا تھڑے کی بحث کا حصہ بننا اور اہل علم کا فریق بن جانا

نقد و جرح! کسی بھی مسلے کے بہترین حل کے لیے بنیادی لوزامات میں سے ایک عملِ خیر ہے۔ اس کے ذریعے درپیش مسلہ پر فریقین کی نہ صرف متفقہ و متضاد آرا سے آگاہی حاصل ہوتی ہے بلکہ مثبت و منفی پہلو بھی اجاگر ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف فریقین کو مطلوب نقطہ نظر پر متفق کیا جاتا ہے تو دوسری طرف مسلہ سے منسلک

4...۔علامہ اقبال۔ بانگ درا۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز 1977۔ ص199

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

مسائل کو حل کرنے میں جو معاونت درکار ہوتی ہے وہ بھی میسر ہو جاتی ہے لہذا یہ کہنا درست ہو گا کہ باہمی وذاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تنقید و تنقیص کا عمل کسی بھی پریشانی وا لجھن کا حل تلاش کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

لیکن یہی طرز عمل جب ذاتیات کا حصہ بن جائے، تضحیک وتذلیل کا آلہ کار بن جائے، دوسروں کی عزتوں کا پامال کرنے کے لیے بلادریغ استعمال کیا جانے لگے تو پھر عدواتیں، نفرتیں اور بغض وحسد جنم لینے لگتا ہے جو انسانی وجود کے ساتھ ساتھ سماجی جسد کو بھی تہہ و بالا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، پھر کسی کی خواہش وطلب کچھ معنی نہیں رکھتی حتیٰ کہ اس کا بویا ہوا بیج اپنی پوری توانائی کے ساتھ چار دانگ عالم میں تباہی نہ مچادے۔

اور یہی طرز ہائے گفتگو عوام الناس سے لے کر بعض اہلِ علم کے کچھ طبقات تک پھیلا ہوا ہے کہ علمی اختلاف ہو یا پھر فکری اختلاف، اجتہادی اختلاف ہو یا قیاسی اختلاف، عقلی و نقلی دلائل پسِ پُشت ڈالتے ہوئے، ہر فرد اپنی زبان و قلم سے تنقید و تنقیص کے لبادے میں تضحیک وتذلیل کے نِشتر فریق مخالف پر بلاروک وٹوک برسائے جارہا ہے جبکہ دعوی عام تصحیح و تصفیح کا دوہرایا جاتا ہے۔ جس کے سبب عام آدمی کے ذہن میں بھی دین کی اساسیات کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں اور وہ اہل دین سے دوری اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے کہ اِن کے آپسی اختلافات ہی تھمنے کا نام نہیں لے رہے، باقی لوگوں کی کیا اصلاح کریں گے۔ بجاکے اس میں اہل علم کی کیا غلطی کہ وہ تو اصلاح ہی کو مقدم جانتے ہیں اور اسی کے پیش نظر دلائل تراشے جاتے ہیں لیکن انسانی وجود میں شیطانی وصف بھی اپنے اثرات رکھتا ہے جو ہمیشہ افراد معاشرہ کو تخریبی کاروائیوں کی طرف ہی راغب کرے گا لہذا! احتیاط کا دامن اہل علم کو ہی تھامنا چاہیے اور انہیں آپس کے اختلافات کو اتفاق رائے سے مل بیٹھ کر طے کر لینے چاہیے اور لوگوں کو صرف اُسی پہلو سے آشنا کروایا جائے جس میں اُن کی بھلائی درکار ہوتی ہے۔ الا یہ کہ کوئی علم وہنر کا متلاشی تحقیق و جستجو کی راہ پر چلتے ہوئے اُن پُر خار وادیوں میں آن پہنچے، جہاں ایسے اختلافات سے لگنے والے کچوکوں کے عوض ملنے والی تکالیف، اذیتیں نہیں دیتیں بلکہ فکری وسعتوں کا لامتناہی جہان آباد کرتی ہیں۔ لہذا جہاں ایک طرف پیغام ربّانی ہے کہ

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[5]

اور لوگوں سے اچھی بات کہوا

تو دوسری طرف حضرت علیؑ کا فرمان عالیشان ہے کہ

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللهُ وَرَسُولُهُ [6]

لوگوں کی معرفت کے مطابق ان سے گفتگو کرو (وگرنہ) کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول مقبول ﷺ کی تکذیب کی جائے؟

8۔ سماجی مسائل سے عارفانہ لاتعلقی

سماجی سطح پر ایک عادت تجاہل عارفانہ کی مظہر بنتی جارہی ہے کہ ہر فرد جانتے بوجھتے بھی برائی کو برائی تبھی گردانتا ہے جب اُس کی زد مخالف پر پڑرہی ہو، اگر اس برائی کا تعلق خود کی ذات سے ہے تو صرفِ نظر والا معاملہ برتا جائے گا یا مصلح کو ہی موردِ الزام ٹھہرا کر بات رفع ودفع کردی جائے گی لیکن حقائق سے سبھی واقف ہوں گے اصل خرابی کہاں واقع ہے۔ عام تفہیم کے لئے ایک حدیث مبارکہ سے استفادہ کیا جائے تو معاملہ کھل کر سامنے آجائے گا۔ جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ

5-البقرۃ 2: 83

6۔ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل۔ صحیح البخاری۔ مصر: السلطانیہ بالمطبوعہ الکبریٰ الامیریہ 1311ھ۔ کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون من قوم۔۔۔ ج1، ص37، رقم الحدیث 127

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

خَيْرُ المُسْلِمِينَ مَنْ سَلِمَ المُسْلِمُونَ مِنْ لِسانِهِ وَيَدِهِ[7]

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں

مذکورہ بالا الفاظ سے ہر مسلمان آگاہ ہے اور خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ اِن الفاظ سے آنحضور اکرم ﷺ کی مراد کیا ہے لیکن آج مسلمانوں نے حدیث مبارکہ کی معنویت کو محدود کر دیا ہے۔ اس سے صرف یہی مراد لیا گیا ہے کہ اگر ایک شخص خود کے ہاتھوں سے دوسروں کو تکلیف نہیں دے رہا، مار پیٹ نہیں کر رہا تو اس حدیث مبارکہ پر عمل کر رہا ہے اور اسی طرح کوئی فرد اپنی زبان سے مخاطب کو کوئی گالی نہیں دے رہا تو بھی اس پر عمل پیرا ہے لیکن کیا حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق کلی طور پر ایسا تصور قائم کرنا درست طریقہ کار نہیں کیونکہ عصر حاضر میں انسانی اعمال کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو اکثریت اس کے برخلاف اعمال میں مبتلا نظر آتی ہے جیسا کہ ایک فرد خود کے ہاتھوں سے تو لوگوں کو اذیت نہیں دے رہا لیکن انہی ہاتھوں سے ایسے زہریلے مواد ملا کر زہریلی خوراک تیار کر رہا ہے جو کہ معصوم بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کی صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے جس کی تصدیق لیبارٹری شواہد کی بنیاد پر بھی مصدقہ شمار کی جاتی ہے لیکن وہ فرد مطمئن ہے کہ سارا فعل درست اقدام کے مطابق ہو رہا ہے جیسا کہ سلانٹی، چپس، بنٹیز، جوسز اور بوتل کے نام پر بننے والے تمام مشروبات۔ یہ سب کے سب انتہائی ناقص مواد سے تیار کیے جاتے ہیں اور صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو چکے ہیں لیکن اس کے خلاف کوئی تحرک پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح محکمہ ادویات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ وہاں کیا کیا خوفناک قسم کی ملاوٹیں کی جا رہی ہیں اور لوگوں کی جیبوں پر کس قدر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے سبھی حضرات واقف ہیں اور اطمینان قلب بھی حاصل ہے کہ حدیث مبارکہ پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی۔ محکمہ مالیات کا مشاہدہ کیا جائے، کیا وہاں چائے و پانی دیے بغیر کوئی بھی کام بروقت کروایا جا سکتا ہے؟ رشوت خوری کا جتنا بھی معاملہ ہے وہ سب کا سب دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف دینے کے زُمرے میں ہی آتا ہے لیکن سبھی کو اطمینان ہے کہ وہ حدیث مبارکہ کے خالف عمل نہیں کر رہے۔

حالانکہ واضح فرمان نبوی ﷺ ہے کہ

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي[8]

جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں

لہذا! اس کے خلاف آواز بلند کرنا کس کے ذمہ ہے؟ معاشرے کو آگاہی دینے کی ذمہ داری کس کے کندھوں پر ڈالی جائے اور ایسی وباؤں سے لوگوں کو چھٹکارا دلایا جائے تاکہ مسلمانوں کی صحت بھی محفوظ رہے اور برائی کی روک تھام کے لیے بھی عملی اقدام کیے جا سکیں۔

9۔ مسلکی برانڈنگ پالیسنگ

عصر حاضر میں خود کے مسلک کی نشر و اشاعت کو ہی حرف آخر سمجھ لیا گیا ہے کہ جو میرے مکتبہ فکر کے لوگ ہیں وہی اصلاح یافتہ ہیں اور مزید رہنمائی کی صرف انہیں ہی ضرورت ہے باقی ہماری ذمہ داریوں میں نہیں آتے اور ہدایت حاصل کرنے کا واحد طریقہ بھی صرف میرے مسلک کے بتلائے گئے طریقے پر عمل کرنے میں ہی مضمر ہے۔ اس لیے میرا اوڑھنا بچھونا صرف میرا مسلک ہے لہذا! اگر کہیں تنقید کرنی ہے تو اس کے لیے دوسرے مسالک کی کتب موجود ہیں، شخصیات موجود ہیں

7۔ ایضاً۔ الفتح الکبیر۔ حرف الخا، ج2، ص93، رقم الحدیث 1649۔

8۔ مسلم بن حجاج القشیری۔ صحیح مسلم۔ ترکی: دار الطباعہ العامرہ 1334ھ۔ کتاب الایمان، ج1، ص69، رقم الحدیث 102۔

اور اُن کے مسلکی یا ذاتی اختلافات موجود ہیں جن پر نقد کیا جانا چاہیے۔ لہذا آج اہل اسلام کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے آپس کے اختلافات کس نوعیت کے ہیں؟ اگر ایک فریق کی دلیل زیادہ مضبوط ہے تو اُسے تسلیم کر لینا چاہیے، اور اگر دونوں فریقین کے دلائل ثابت شدہ اور درست ہیں تو اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جیسا کہ بعض اوقات بظاہر دو متضاد و مستند احادیث میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے تاکہ دونوں ہی عملی صورت میں آسکیں۔ یہی کاوش آپس کے معاملات میں بھی بروئے کار لائی جانی چاہیے تاکہ اختلافی نقطہ نظر کا دائرہ کار کم سے کم کیا جا سکے اور رب تعالیٰ کے فرمان کی عملی تصویر پیش کی جا سکے کہ

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا[9]

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو۔

10۔ تعبیرات و تشریحات کا تفاوت

دورِ حاضر میں ٹیکنالوجی کی بدولت متفرق علوم کا باہم منسلک ہونا، دوسروں کے ساتھ اشتراک کرنا اور بآسانی دستیاب ہونا جیسی سہولیات پیدا ہو گئی ہیں۔ جہاں ایک طرف معلومات کا بحرِ بے کنار بآسانی دستیاب ہے، وہیں اُنہی معلومات کے مصدقہ و غیر مصدقہ ہونے کے حوالے سے بھی شکوک و شبہات موجود ہیں۔ ہر فرد اپنی اختراع کردہ فکر کے مطابق معلومات کو اکٹھا کر سکتا ہے اور انتہائی آسانی کے ساتھ دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ انہیں سیدھی راہ سے گمراہ بھی کر سکتا ہے۔

ہدایت و گمراہی کے راستے پہلے کی نسبت آج زیادہ سہولت کے ساتھ رسائی میں ہیں جیسا کہ ملک پاکستان کی ہی مثال لی جائے تو کچھ عرصہ قبل کوئٹہ میں ہونے والے ٹرین حادثے کے بعد سوشل میڈیا پر گردش کرنے والے جہادی گروہوں کی طرف سے دیے جانے والے فتاوٰی کہ جن میں ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے کا استدلال اختراع کیا گیا تھا۔ تو ایسے تمام عناصر جو خود کی انتشاری فکر اسلامی تعلیمات سے ثابت کرتے ہوئے معصوم جانوں کو قتل کرنے جیسے قبیح فعل کو سرانجام دینے کا رحجان پیدا کرتے ہیں وہ بھی اسی ٹیکنالوجی کے سبب ہی ممکن ہو رہا ہے۔

دوسری طرف صاحبانِ محراب و منبر کو بھی اپنے خطبات و تقاریر میں توازن پیدا کرنا ہوگا۔ ایک طرف سماجی سطح پر بیان کئے جانے والے مسائل میں ایک طبقہ کو اسقدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے کہ آج اس طبقہ نے اپنے غلط عمل کو بھی درست قرار دے لیا ہے اور اسی پر ڈٹا بھی ہوا ہے جیسا کہ مقررین جب والدین کے حقوق بیان کرتے ہیں تو وہ احادیث بیان کریں گے جن میں فرمایا گیا کہ اولاد کے مال اور اُس کی کھال پر بھی والدین کا حق ہے۔ بجا فرمایا گیا کہ یہ حق انہیں حاصل ہے لیکن دوسری طرف اُن احادیث کا ذکر نہیں کیا جاتا جن میں آپ ﷺ نے گواہ بننے سے انکار فرما دیا کیونکہ والد نے تمام اولاد کو برابر کا تحفہ عطا نہیں کیا تھا۔ تو جہاں ایک طرف اولاد، والدین کے سامنے اُف کرنے سے بھی گھبراتی ہے کہ کہیں آخرت نہ خراب ہو جائے وہیں آج والدین اپنی اولاد میں فرق کرنے میں مگن ہیں، کسی کے بڑھاپے تک ناز و نخرے اٹھائے جا رہے ہیں اور کسی کو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں دھتکار دیا جاتا ہے، کسی کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں اور کسی کو بوند بوند کے لیے ترسایا جاتا ہے، کسی کو ذاتی پسند کی بنیاد پر وراثت کا کلی حقدار ٹھہرایا جاتا ہے اور دوسرے کو ناپسند ہونے کی وجہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

9۔ آل عمران 3 :103

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

بعد کے لڑائی جھگڑے وعدالتی کاروائیاں ایک طرف والدین کو کون سمجھائے کہ وارثت میں سبھی کے ساتھ یکساں اور مساوی سلوک کیا جانا چاہیے لیکن اُن کی ایسی ذہن سازی خطبات وتقاریر کے سبب ہی کی گئی ہے جس کی وجہ سے گھر اجڑ رہے ہیں، زوجین میں تفریق کروانے میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ والدین کا بھی بنیادی کردار نظر آتا ہے کبھی بہو پسند نہیں اور کبھی بہو کے گھر والوں نے جہیز مطلوبہ مقدار میں نہیں دیا و دیگر پہلو بھی اس کے ساتھ منسلک ہیں

لہذا مسلم سماج کو آج غلط فکری آبیاری جیسے سنگین و خطرناک قسم کے مسائل کا بھی سامنا ہے جس سے نوخیز اذہان کو راہ راست سے بھٹکانا سہل تر ہو گیا ہے جبکہ دوسری طرف ملکی وسماجی سطح پر کوئی مؤثر نظام ہائے احتساب موجود نہ ہو، کسی کو سزا کا خوف نہ ہو حتیٰ کہ مزید تخریب کاری کرنے کے لیے سہولت کار بھی موجود ہوں تو ملکی نظام کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بھی اجتماعی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ نگرانی کے فرائض کو پہلے کی نسبت سخت تر کر دیا جائے تاکہ روشن مستقبل کی نوید نسل کو محفوظ کیا جاسکے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالی بھی ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ[10]

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لو کہ کہیں کسی قوم کو انجانے میں تکلیف نہ دے بیٹھو پھر اپنے کئے پر شرمندہ ہونا پڑے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى أَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ، وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ، أَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ[11]

آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پس امام (امیر المؤمنین) لوگوں پر نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہو گا اور کسی شخص کا غلام اپنے سردار کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہو گا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پرسش ہو گی۔

لہذا اس پہلو کی طرف بھی فرد، خاندان، معاشرہ اور ملکی قوانین بنانے والوں کو توجہ دینی چاہیے کہ جو آگ ملکی سرحدوں پر لگی ہوئی ہے وہ مسلم سماج کے دشمن عناصر سوشل میڈیا کے ذریعے نسل نو کے اذہان میں آہستہ آہستہ منتقل کر رہے ہیں اور نوجوانان ملت کافی حد تک ان عوامل کا آلہ کار بھی بنتے جا رہے ہیں لہذا ہنگامی سطح پر اس کا تدارک کیا جانا چاہیے تاکہ قحط الرجال پیدا ہونے سے قبل ہی معاشرہ ہوش کے ناخن لے ورنہ بقول علامہ اقبالؒ

10۔ الحجرات 49: 6

11۔ صحیح بخاری۔ کتاب الاحکام، ج9، ص62، رقم الحدیث 7138۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے۔ کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف۔[12]

11۔ عوامی سطح پر بڑھتا ہوا اضطراب اور بداعتمادی

عوامی سطح پر یہ اعتماد کا کامل اظہار نہیں ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو مدارس میں بھیج رہے ہیں، اس کے پسِ پردہ بھی کچھ حقائق ہو سکتے ہیں جیسا کہ کچھ والدین تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے بھی مدارس بھیج دیتے ہیں، کچھ والدین سمجھتے ہیں کہ اُن کا بچہ دنیوی تعلیم میں مطلوبہ معیار کی قابلیت نہیں رکھتا لہذا اُسے کچھ نہ کچھ زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے تو دینی تعلیم کی طرف ہی کھپا لیا جائے تاکہ درست وغلط کی پہچان کر سکے، کچھ ایسے بھی والدین ہوتے ہیں جو تمام اخراجات کو بخوشی قبول کر سکتے ہیں لیکن دنیوی تعلیم کی طرف ان کا رحجان نہیں ہوتا لہذا مدارس کے ماحول کے مطابق وہ بھی ادائیگیوں کی طرف دھیان نہیں دیتے کیونکہ نظام ایسا ہے کہ چلے جا رہا ہے لہذا! انہیں دردِ سر لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور کچھ ایسے بھی ہیں جو تمام پہلوؤں سے واقف ہونے کے باوجود بھی ادائیگی نہیں کرتے بلکہ جہاں وظائف کے لیے درخواستیں جمع ہوتی ہیں وہاں اُن کی درخواست سرِفہرست پڑی ہوتی ہے لہذا کامل طور پر یہ دعوی درست نہیں نکہ مدارس کو عوام کا اعتماد حاصل ہے، اس سے یہ فکر واضح ہوتی ہے کہ جو طلبہ وطالبات مدارس کی طرف رجوع نہیں کرتے یا والدین نہیں آنے دیتے، انہیں اِس نظام تعلیم پر اعتماد نہیں۔ اگر ایسا ممکن ہے تو بھی مدارس کے مقاصد کے عین مطابق وہ بھی اصلاح احوال کے حقدار ہیں، انہیں بھی دین کی تعلیمات سے روشناس کروانا انہی طلبہ کا اہم فریضہ ہے جس سے صرف نظر کرنا ہرگز ممکن نہیں۔

دوسرے جہت کی طرف توجہ مرتکز کی جائے کہ عام انسان مدارس کے نظام سے مضطرب دیکھائی دیتا ہے تو اِس کے پسِ پردہ بھی باہمی اختلافات کو تھڑے کی مباحث کا حصہ بنانا ہے کہ جہاں لوگ چائے پینے کے بہانے یا وقت گزاری کے لیے جمع ہوتے، وہیں علما کرام کے آپسی معاملات کو زیر بحث لایا جانے لگا ہے کہ فلاں عالم دین نے یہ بات کہی ہے اور فلاں نے اُس کا منہ توڑ جواب دیا ہے، فلا مسلک کے مولوی نے یہ کام کیا ہے اور فلاں مسلک کے مطابق یہ مطلق حرام ہے لہذا وہ تو کافر کے زُمرے میں شمار ہوگا و دیگر۔

حالانکہ ایسے تمام موضوعات چاہے اُن کا تعلق آئمہ اربعہ سے منسلک مسالک میں موجود اختلاف سے ہو، علما کا فکری یا اجتہادی اختلاف سے ہو، گروہی مفادات کا معاملہ ہو یا پھر ذاتی اختلافات کا ہی کیوں نہ مسلہ ہو، یہ سب کسی ایک متعین شدہ طریقہ ہائے گفتگو کے ذریعے نمٹائے جانے چاہیے تھے لیکن عام مباحث کا حصہ بننے کے سبب لوگ علما سے بدظن ہونے لگتے ہیں جہاں سے بداعتمادی جنم لیتی ہے اور آہستہ آہستہ اضطرابی کیفیات کے بعد قطع لاتعلقی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ کیا آپسی اختلافات کے لیے کوئی طریقہ کار وضع نہیں کیا جا سکتا، جس کی خلاف ورزی (کہ جب دونوں آپس میں لڑ پڑیں تو جو زیادتی کرے اُس کے ساتھ جدل (بحث ومباحثہ کے ذریعے) کرو اور رجوع کرنے کی صورت میں دونوں کی آپس میں صلح کروا دو۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَاۚ-فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِۚ-فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْاؕ-اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ[13]

12۔ علامہ اقبال۔ ضرب کلیم۔ دہلی: غالب اکیڈمی 1976ء۔ دین و تعلیم، ص86۔

13۔ الحجرات 49 :9

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر اگر وہ پلٹ آئے تو انصاف کے ساتھ ان میں صلح کرواد و اور عدل کرو، بیشک اللہ عدل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

کیا یہ قتال صرف تلوار، نیزہ، بھالا یا کسی آلاتِ حرب وضرب سے ہی ممکن ہے؟ یہاں باہمی گفتگو مراد نہیں لی جاسکتی، دلائل سے مخالف فریق کو قائل نہیں کیا جاسکتا، اصلاح احوال کے لیے یہاں سے کچھ اصول وضوابط اخذ نہیں کیے جاسکتے؟ مختصراً کہا جائے تو مذکورہ آیت کے مطابق سبھی اتفاقی نقطہ نظر قائم کرتے ہوئے زیادتی کرنے والے کے خلاف سخت ردعمل دیا جائے تاکہ مستقبل کے لیے دوسرے عبرت حاصل کریں۔

12۔ نقد و جرح کے اصول ضوابط

ہر سطح پر بحث ومباحثہ کے کچھ اصول ضوابط طے ہوتے ہیں کہ اخلاقی پہلوؤں کا لحاظ رکھا جائے گا، کسی کا مقام مرتبہ مقدم ومعتبر گردانا جائے گا، کسی کی ذاتی حیثیت میں تذلیل وتحقیر نہیں کی جائے گی ودیگر۔اِن قواعد کا اوّلین مقصد یہی پیشِ نظر ہوتا ہے کہ ہر فرد کی عزت نفس محفوظ رہے، کسی جگہ ومقام پر دل آزاری نہ کی جائے اور جس مسلہ کے حل کے لیے محفل، مجلس یا کانفرنس کا انعقاد کیا گیا ہے، ساری توجہ اُسی پر مرتکز رہے لیکن عصر حاضر میں معمولِ عام بن گیا ہے کہ درست وبروقت تنقید اُسے مانا جائے گا جو کہ مخالف پر کی گئی ہو، خود کی ذات پر اصلاحی نقطہ نظر سے کہی گئی بات بھی تذلیل شمار کی جائے گی مگر جب بات مخالف شخص، گروہ، جماعت فرقہ ومسلک پر تنقید کی ہو تو بلادلیل وحجت اُس تنقید کو درست تسلیم کیا جائے گا۔

اور ایسا چلن نہ صرف عام عوام کا ہے بلکہ صاحبان علم بھی اِس عمل میں پیش پیش ہیں کہ حق وباطل کا فرق واضح تر کرنا اِنہی کی ترجیح اوّل ہے کجا کہ دین وملت کی اساسیات کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ قرآان وسنت میں نقد کرنے کے حوالے سے بھی تحدیات کا تعین کیا گیا ہے اور جن پر کھل کر تنقید کرنی چاہیے وہاں بھی پہلے دلائل سے قائل کیا گیا ہے اور پھر بعدازاں لعنت جیسے الفاظ مستعمل ہیں، اتمام حجت کی گئی ہے تبھی اُنہیں رحمت سے دوری کی خوفناک خبر دی گئی ہے لیکن یہاں کا معمول خاصا بدل چکا ہے، تنقید ہمہ وقت ہوگی، سرعام ہوگی اور بلاحیل وحجت ہوگی۔ لہذا اہل دانش کو اس حوالے سے بھی غور وفکر کرنا چاہیے کہ مبلغین کی فکری اصلاح کے لیے نقد وجرح کے اصول بھی اَزبَر کروائے جائیں اور باور کروایا جائے کہ علمی تنقید کو ہی محورِ گفتگو رکھا جائے نہ کہ ذاتی، شخصی یا انفرادی حیثیت سے زہر آلود نِشتر چلائے جائیں۔

13۔ تنقید برائے تقابل سے اجتناب

اہل علم کے ہاں یہ چلن عام ہوتا جارہا ہے کہ جب تنقید کی جائے گی تو تقابل بھی ساتھ ساتھ بیان کیا جائے گا کہ ہمارے یہاں یہ چیز رائج ہے تو مخاطب کے ہاں یہ چیز بھی تو رائج ہے لہذا اُسے ہم پر تنقید کرنے سے پہلے خود کے گریبان میں جھانکنا چاہیے اور پھر فیصلہ کرے کہ اُسے تنقید کرنے کا حق پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ جیسا کہ مدارس ویونیورسٹی کے وسائل ومسائل کی بات کی جائے تو یہاں پر بھی پہلے تقابل کو بیان کیا جاتا ہے کہ اہل مدارس کس طرح اپنے انتظامی وتعلیمی اخراجات کا انتظام کررہے ہیں جبکہ دوسری طرف یونیورسٹیز کو حکومت کی طرف سے اور بیرونی امداد کی صورت میں بھی معاونت حاصل ہوتی رہتی ہے لہذا دونوں کے جب وسائل ایک جیسے نہیں تو جو کارکردگی یونیورسٹیز دیکھارہی ہیں وہ مدارس سے کیوں مطلوب ہوتی ہیں ودیگر عوامل۔

زبانِ قال سے یونیورسٹیز کا حال بیان کیا جائے تو وہاں ایک اکانومی نظام کار فرما نظر آتا ہے، وہاں ماہرین معیشت کا گروہ کامل یکسوئی سے یونیورسٹی کے انتظامات کی دیکھ وبھال کررہا ہوتا ہے، نفع ونقصان کو پرکھا جاتا ہے اور غالب گمان یہی ہے کہ منافع کو ترجیح دی جاتی ہے کہ اساتذہ کا روزگار اسی سے منسلک ہے کہ کتنے فیصد طلبہ وطالبات امتیازی نمبر زلے کر پاس ہوتے ہیں اور ناکام ہونے کا کسی طالب علم کو تصور بھی نہیں کرنا چاہیے، تعلیمی اخراجات کے حوالے سے اس قدر سخت اصول اپنائے جاتے ہیں کہ اگر ایک طلب علم فیس ادا نہ کرے تو کمرہ امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین بھاری بھر کم فیس جمع کرواتے ہیں لیکن جب کسی طرف سے کوئی بات نہیں بن رہی ہوتی تو تھک ہار کر جب انتظامیہ سے رابطہ کیا جائے تو دو حرفی جواب ملے گا کہ فلاں بچہ میرٹ پر نہیں آیا لہذا! اس لیے متعلقہ طلبہ کو اطلاع نہیں دی گئی اور فیس کی واپسی کا ایک الگ دشوار گزار مرحلہ در پیش ہوتا ہے، مل جائے تو سبحان اللہ اور نہ ملے تو لوگ استغفر اللہ کہہ کر جان خلاصی کروالیتے ہیں اور اکثر اوقات لوگوں کو دوسرے آپشن پر عمل کرتے ہی دیکھا گیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کو دیکھا جائے تو نفع ونقصان مطمع نظر رہتا ہے لیکن انسان کی ذات پس پردہ چلی جاتی ہے، اس کو مالی کتنا نقصان ہوا، ذہنی طور پر کس قدر اذیت میں مبتلا رہا اور اُس کے بعد کیا حالات اس پر بیتے یونیورسٹیز کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا لہذا اہل مدارس خود کا تقابل ایسے نظام سے نہ کریں۔ یہاں دل میں خوفِ خدا رکھنے والے احباب بھی موجود ہوتے ہیں جو خلقِ خدا کی خدمت اس جذبہ سے کرتے ہیں کہ ان کے داہنے ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں مالی نفع ونقصان کو ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ آخرت میں نامہ اعمال کے بھاری ہونے کو مقدم رکھا جاتا ہے، حلال وحرام کی کڑی پابندی کی جاتی ہے اور لقمہ حلال کو ہر حال میں فوقیت و برتر مانا جاتا ہے حالانکہ مالی ضروریات کا پورا کرنا اور اُن کے لیے جدوجہد کرنا یہاں بھی لازمی امر ہے کیونکہ اُن اساتذہ کے کندھوں پر بھی والدین وبچوں کو پالنے کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن وہ نفسا و نفسی کا عالم مدارس کے منتظمین میں کم دیکھا جاتا ہے جو یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔ علی ہذا القیاس! مختصراً کہا جائے تو تنقید کرتے ہوئے ایسا تقابل نہ کیا جائے جس کی بنیاد ہی درست نہیں۔ مدارس کا ایک منفرد مقام ومرتبہ ہے جس کی مثل بھی نہیں اور موازنہ بھی نہیں۔

14۔ میوچل یا ورچوئل فنڈنگ کا نظام کار

مدارس انتظامیہ سے ایک دردمندانہ درخواست بھی کی جاتی ہے کہ مدارس کے اساتذہ کرام کے لئے ایک ورچوئل یا میوچل فنڈنگ کا نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعے اُن اہل مدرسین کی مالی امداد کی جائے جو اِس کے مستحق ہیں۔ یہاں یہ اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ اس طرح اُس رقم کا غلط استعمال ہونے کا خدشہ پیدا ہو جائے گا کہ ہر مقرر ہونے والے امیر کی ایما پر منحصر ہوگا کہ جس طرح چاہیے اُس رقم کو استعمال میں لائے اور جسے چاہے عطیہ کے طور پر دے دے ودیگر کئی سوالات۔

ایسے خدشات ہر اُس اجتماع کا لازمی جزو ہوتے ہیں جہاں کچھ افراد مل کر سفر کرنے لگیں یا پھر دوستانہ ماحول میں کسی ضیافت کا بندوبست کیا جائے جبکہ حقیقتِ حال بعض اوقات خدشات کے برعکس بھی ہوتی ہے جو کہ مشاہدہ عام کی بات ہے۔ اس طرح کے تمام تفکرات سے محفوظ رہنے کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے صاحبِ علم و سرکردہ افراد پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جائے، اُس بورڈ کے زیرِ نگرانی ایک خودکار طریقے سے فنڈ جمع کرنے کا نظام وضع کیا جائے، اُس نظام کے تحت ایک آن لائن فارم متعارف کروایا جائے جس کے ذریعے پورے ملک سے تمام مکاتبِ فکر کے افراد درخوست دینے کے اہل ہوں اور اُن سے آن لائن فارمز ہی وصول کئے جائیں، پھر اُن فارم کی چھانٹی کی جائے اور مقامی سطح پر سبھی مکاتبِ فکر کے افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو درخواست دینے والے لوگوں کی جانچ وپڑتال کرے۔ اُس جانچ وپڑتال کے مراحل میں درست ثابت ہونے والے درخواست گزاروں کے فارم اگلے مرحلے کے لیے قبول کر لیے جائیں اور جو لوگ جعل سازی میں ملوث پائیں جائیں، اُن پر ایک متفقہ فیصلہ کے تحت کچھ عرصہ یا تاحیات دوبارہ درخواست دینے کی پابندی لگادی جائے اور جو مستحق ہیں ان کی مالی مدد کی جائے. اس

تمام عمل سے اُن علما کرام کی مالی معاونت ہو سکے گی جن کا خاندانی پسِ منظر مستحکم نہیں یا جو کسی بھی صورت حال کے سبب مشکلات کا شکار ہیں۔اس سے علما کرام کو کبھی کچے گھر کی چھت کے نیچے دب کر وفات پانے سے، کبھی کسی انتظامیہ کے تشدد کے باعث مالی مسائل میں گھیر جانے سے اور کبھی بچوں کے شادی وبیاہ کے لیے مختلف اخراجات جیسے مصائب سے بچنے میں مدد حاصل ہو جائے گی اور اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے والے معاونین کی بابت گفتگو کی جائے تو اصلاح احوال کے لیے جب اجتماعی سطح پر کوششیں بروئے کار لائی جائیں گی تو انفرادی سطح پر کی جانے والی کدو کاوش سے بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔اس فنڈ کا سالانہ یا پانچ سال بعد اڈٹ بھی کروایا جانا چاہیے اور شفافیت کو ہر صورت میں یقینی بنایا جانا چاہیے تاکہ ایک طرف یہ رقم مستحقین تک پہنچ سکے اور دوسری طرف جنہوں نے وہ رقوم مختص کی ہوئی ہیں انہیں کامل یقین ہو کہ ایک بہتر نظام کے ذریعے اُن کا خرچ کیا گیا مال وزر، کل بروز قیامت اجر وثواب کا باعث بھی بنے گا۔

15۔نظام تعلیم میں اصلاحاتی تجویز

عمومی طور پر دونوں طرح کے جامعات میں جو نظام تعلیم رائج ہے وہ صرف معلومات کو طلبہ تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے جس کے باعث مختلف علوم سے طالبین علم کو آگاہی دی جاتی ہے جبکہ حقیقت حال سے کوئی بھی طالب علم واقف نہیں ہوتا کہ سکول، کالج یا یونیورسٹی سطح تک بھی اکثریت وہی طرز تعلیم اختیار کئے ہوئے ہے جس کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ صرف مطلوبہ معلومات کی منتقلی اور دوسری طرف مدارس کے نظام تعلیم کا بھی جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی نصاب کو مطالعاتی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔بہت کم سماجی یا معاشرتی سطح پر موجود مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی تگ ودو کی جاتی ہے کہ ایسے معاملات سے تخصص کرنے سے ہی واقفیت حاصل ہو پاتی ہے۔

لہذا عملی تربیت کا پہلو دونوں اطراف میں خالی رہ جاتا ہے اور جب طلبہ جامعات کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہیں تو تفکرات وتصورات کے برعکس حقائق سے سامنا ہونے پر بہت سارے افراد کے ہاتھ وپاؤں پھول جاتے ہیں اور زندگی کانٹوں کی سیج پر گزرنے کے مناظر آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگتے ہیں۔کیا تعلیمی نظام میں موجود اس کمی کو صرف چھ (٦) ماہ کی انٹرنشپ سے دور نہیں کیا جاسکتا؟ کیا سر براہان ادارہ کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکتے کہ جس کے ذریعے ہر طالب علم کو کسی نہ کسی ہنر سے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ ہنر اُسے عملی زندگی کا آغاز کرنے میں معاونت فراہم کرے یا فی الحال اُس کے کام نہیں بھی آرہا تو کل کلاں ارذل لعمر کا سفر جب شروع ہو، دوست احباب ورشتے دار منہ پھیر لیں ،کچھ مالی وسائل بھی دستیاب نہ ہو سکیں تو وہ سیکھا ہوا ہنر تب بروئے کار لایا جاسکے اور عائد ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے میں آسانی پیدا ہو۔لہذا دینی جامعات میں کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جانا چاہئے جہاں علوم وفنون میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور طلبہ کو صرف قال کا نہیں حال کا درس بھی دیا جائے تاکہ انتظامیہ کی بیسا کھیوں پر انحصار کم سے کم کیا جائے اور خود انحصاری کا ماحول پروان چڑھایا جائے اور مدرسین کے پیش نظر یہ نقطہ نظر بھی موجود ہو گا کہ دنیوی تعلیم کے جامعات کا مقصد داعی دین پیدا کرنا نہیں بلکہ متعلقہ مضمون میں لوگوں کو تخصص کروانا ہے یا ڈاکٹریٹ کی سند دلوانا مگر دینی مدارس کی ذمہ داری اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ اس نے ایک ڈاکٹر کو بھی دین بتانا ہے،ایک انجینئر کو بھی ،ایک فارماسسٹ کو بھی،ایک ایکانومسٹ کو بھی، ایک سیکالوجیسٹ کو بھی،ایک ارکیالوجیسٹ کو بھی،ایک شاعر کو بھی،ایک فلاسفر کو بھی،ایک صحافی کو بھی اور ایک سپاہی کو بھی۔

کیا کبھی مذکورہ بالا یا ان کے علاوہ بھی دیگر شعبہ جات کے حوالے سے عالم دین نے تیاری کی کہ جب وکیل سے بات کی جائے تو اُسے کیسے بتایا جائے کہ دین میں وکالت کی کیا خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جب ایک جج کو قرآن پڑھایا جائے تو فیصلہ کے بارے میں فقہی معاملات سے کیسے استفادہ کرنا ہے؟ کیا کسی بینکر کو شرعی اصول ضوابط بتائے گئے ہوں، کبھی کسی وکیل کو بلا کر ملکی قوانین سے آگاہی دلائی گئی ہو، کبھی کسی ڈاکٹر کو بلا کر مستقبل کے بارے میں دینی علوم کے طلبہ کو آگاہی دلائی گئی ہو، کبھی کسی ملکی ادارے کا وزٹ کروایا گیا ہو تاکہ طلبہ سماج کا حصہ بننے سے پہلے ہی اسے اچھی طرح سمجھ لیں اور مفید شہری بن کر مدارس سے نکلیں، کیا کبھی کسی طالب علم کو ملکی سطح پر ملازمتوں کے حصول کے لیے مختلف ذرائع سے آگاہی دلائی گئی ہو تاکہ علما کرام اگر ملازمت اختیار کرنا چاہیں تو ان کے لیے کیا کیا آپشن موجود ہیں اور اگر نہیں بھی کرنا چاہیں تو سماج میں ان کے لیے کیا کیا وسائل موجود ہیں جن سے وہ خود اور خاندان کی کفالت کے لیے روٹی وروزی کا ذریعہ چلا سکتے ہیں سوائے

مسجد انتظامیہ پر انحصار کرنے کے ودیگر کئی اہم جہات موجود ہیں جن بحث کی جانی چاہیے اور اُن کے حوالے سے سنجیدہ لائحہ عمل مرتب کیا جانا چاہیے تاکہ مدارس کا کردار مزید نکھر کر سامنے آئے اور فلاح و بہبود کے کاموں میں پورے جہاں کی رہنمائی کرے۔

نتیجۃ البحث

اصلاحِ معاشرہ میں مدارس کا کردار ایک سربراہِ خانہ کی مانند ہے کہ جس نے خود کی ذات میں بھی توازن قائم رکھنا ہے تاکہ عائد ذمہ داریوں کو احسن انداز میں نبھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہ سکے اور اصلاحِ احوال پر بھی نظر رکھنی ہے تاکہ راہِ راست پر استقامت سے چلتا رہے اور دوسروں کو رہنمائی فراہم کر سکے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا پہلو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اُسے نگران بھی مقرر کیا گیا ہے اور ہر نگران کے ماتحت اُس کی رعایا ہوتی ہے جس کی پرورش، تربیت اور اصلاح و فلاح کے حصول کے لیے درپیش مختلف طریقوں سے آگاہی دینا بھی اُسی کے ذمے ہے کہ یہ ایسے عوامل ہیں جن سے احادیث نبوی ﷺ میں بتلائی گئی تعلیمات کے مطابق، پہلو تہی کرنے پر سخت بازوپُرس اور اُخروی نجات کا راستہ مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے لہذا سربراہان کو ایک سانچہ کامل طور پر تیار رکھنا چاہیے تاکہ نئی نسل کو اُسی متعین کردہ سانچے کے مطابق ڈھالا جائے اور معاشرے کا ایک مفید شہری بنایا جائے۔ لیکن عصر حاضر میں کئی جدید مسائل بھی سامنے آچکے ہیں اور اُن سے صرف نقلی دلائل سے نبرد آزما نہیں ہوا جا سکتا کہ اُن کے داعیین قرآن و سنہ کی اطاعت کو خود کے لیے لازمی قرار نہیں دیتے، انہیں عقلی دلائل پر ہی کائنات کی ہر شے کو پرکھنا ہے، جو اُن کے طے کردہ سانچے میں اترتی ہے وہی شے درست قرار دی جاتی ہے لہذا عصری مسائل سے آشنائی بھی مدرسین کے پیش نظر رہنی چاہیے تاکہ مخاطبین کو حکمت و موعظت کے مطابق دعوت دی جا سکے۔ اسی کے ساتھ ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ اہلِ مدارس کو آپس کے اختلافات کو طے کرنے کے لیے بھی اصول وضوابط کا ایک نظام وضع کرنا چاہیے جس کی پابندی ہر کس و ناکس پر لازم ہو گی اور جو اس اتحادی نقطہ نظر سے لایعنی اختلاف کرے گا اُسے عبرت کا نشان بنایا جائے گا کیونکہ اُس نے وہ راہ اختیار کی جس سے معاشرے کی اجتماعیت کو نقصان پہنچتا ہے، اتحاد و اتفاق میں دراڑ آتی ہے، لوگوں کے ذہنوں میں اہل علم کے بارے میں شکوک شبہات جنم لیتے ہیں لہذا اُسے احساس دلایا جانا چاہیے کہ علمی و فکری اختلاف اپنی جگہ پر لیکن مجموعی شکل میں بگاڑ پیدا نہیں کیا جائے گا اور یہی سبھی کو مطلوب و مقصود ہونا چاہیے۔